ارض القرآن کا سفر

(از جناب محمد عاصم صاحب)

(۷)

عصر کے بعد ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عبداللہ بن کلیب اور ان کے ساتھ ان کے اور ہمارے دوست مقبول عبدالکافی تشریف لاتے۔ شیخ عقیل العطاس، مکہ معظمہ میں ہمارے معطوف بھی تشریف لاتے، بڑی ہی محبت اور پُرتپاک طریقہ پر ملاقات کی۔ رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے بتایا کہ یہاں میرے ایک دوست شیخ سلیمان الصنیع ہیں جو مقامی مجلس شوریٰ کے رکن بھی ہیں۔ انہیں مکہ معظمہ کے آثار سے گہری واقفیت اور دلچسپی ہے میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔ آثار کے دیکھنے اور سمجھنے میں وہ آپ لوگوں کی بڑی مدد کریں گے۔ پہلے ہی قدم پر یہ خوشخبری سُن کر ہم نے اطمینان اور خوشی کا سانس لیا۔ مغرب کے بعد حرم میں بعض پاکستانی احباب سے ملاقات ہوئی

حرم کی نماز حج کے دنوں میں تو حرم میں نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہی ہے، لیکن دوسرے دنوں میں بھی یہ تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ ظہر اور عصر کی نمازوں میں مطاف اور چاروں طرف کے برآمدے نمازیوں سے بھر جاتے ہیں، مغرب، عشا اور صبح کی نمازوں میں مطاف اور برآمدوں کے علاوہ صحن (جہاں کنکریاں بچھی ہوئی ہیں) میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ یہ تعداد حج کے دنوں کے مقابلہ میں کتنی ہی کم ہو، لیکن پھر بھی دنیا بھر کی کسی مسجد میں نمازیوں کی اتنی تعداد کبھی نہ ہوتی ہوگی۔ نماز با جماعت کے اوقات کو چھوڑ کر سال بھر میں ایک منٹ بھی ایسا نہیں آتا جب اللہ کے بندے کعبہ کا طواف اور حجرِ اسود کی تقبیل و استلام نہ کر رہے ہوں۔ سنا ہے چند سال ہوئے مکہ معظمہ میں سخت بارش ہوئی، جس کی وجہ سے مطاف پانی سے بھر گیا، لیکن اس

حال میں بھی اللہ کے بہت سے بندے پانی میں تیر کر طواف کرتے رہے۔ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے نے بے آب و گیاہ ریگستان کے اندر اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا اور دنیا بھر کے انسانوں کو اس کی طرف پکارا۔ یہ اسی پکار کی بازگشت ہے کہ دنیا بھر کا مسلمان ہر ملک اور ہر خطہ سے ہر موسم میں لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک . . . کہتا ہوا اس گھر کی طرف کھنچا چلا آتا ہے، اور جو نہیں آسکتا، وہ اس کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ آج سے چار ہزار سال پہلے سے جاری ہے اور جب تک روئے زمین اسلام کے ماننے والے باقی ہیں، یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری ہی رہے گا۔ یہ آخر اسلام کے دینِ الٰہی ہونے کی نہایت اہم دلیل نہیں ہے تو کیا ہے؟

مکہ معظمہ کا موسم مکہ معظمہ میں ہمیں جدہ سے بھی زیادہ گرمی محسوس ہوئی۔ نومبر کے آخر اور دسمبر کے شروع کا موسم تھا، لیکن گرمی کا یہ عالم تھا کہ ہم رات کو نہ صرف دروازے کھول کر بلکہ بجلی کا پنکھا لگا کر سوتے تھے۔ گرمی کے علاوہ مچھر بھی بڑی کثرت سے تھے۔ بجلی کا پنکھا اس لیے بھی لگانا پڑتا تھا کہ مچھروں سے بچنے کے لیے چادر کا اوڑھنا ضروری تھا، لیکن چادر اوڑھتے تھے تو سخت گرمی محسوس ہوتی تھی۔ جب تک ہم مکہ معظمہ میں ٹھہرے رہے، ہر رات سونے کے سلسلے میں ہمارا یہی معمول رہا۔ صبح کے وقت ہم بہت سے لوگوں کو کھلی چھتوں پر مچھر دانیاں لگا کر سوتے پایا کرتے تھے۔ ان دنوں میں بھی برف کا استعمال وہاں عام ہوتا تھا۔

پاکستانی شفاخانہ اگلے دن (یکم دسمبر) مولانا جاتے قیام پر رہے۔ چودھری غلام محمد صاحب کی طبیعت خراب تھی اس لیے ہم دونوں ہسپتال گئے۔ مکہ معظمہ میں حاجیوں کی طبی امداد کے لیے پاکستان کی طرف سے ایک شفاخانہ قائم ہے، جو سال کے دوسرے دنوں میں بھی کام کرتا رہتا ہے۔ چودھری صاحب نے وہاں سے دوا لی اور ٹیکہ لگوایا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ شفاخانہ بہت خوب کام کر رہا ہے۔

وزارت داخلیہ اس کے بعد میں اور چودھری صاحب وزارت داخلیہ گئے۔ جس کا دفتر

ریاض کے بجائے مکہ معظمہ میں ہے۔ اس کے مدیر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ امیر مُساعد کے تار پر ہم نے مدیر الامن العام (غالباً انسپکٹر جنرل پولیس) کو ہدایات بھیج دی ہیں۔ آپ لوگ ان سے ملیں۔ مدیر الامن العام کے پاس آئے، تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے تمام مقامات پر آپ لوگوں کو التسہیلات والارشادات اللازمہ (ضروری ہدایات اور آسانیاں) بہم پہنچانے کے لیے تار روانہ کر دیئے ہیں، اس لیے اب آپ لوگ پورے ملک میں جہاں چاہیں، پھر سکتے ہیں، کہیں کوئی دقت پیش آئے تو پولیس والوں سے مدد لیجیے ۔۔۔ یہ سب آسانیاں امیر مُساعد کے تار کی وجہ سے حاصل ہوئیں، ورنہ محض پاسپورٹ پر ایک اجنبی مسافر کے لیے سوائے ان مقامات کے جن کی تصریح اس کے پاسپورٹ پر کر دی گئی ہو، سعودی مملکت کے اندر گھومنا ممکن نہیں۔ جو لوگ عمرہ کے لیے جاتے ہیں، انہیں صرف مکہ معظمہ، جدہ اور مدینہ منورہ میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہوتی ہے

آثار کی زیارت | عصر کے بعد ہمارا پروگرام مکہ معظمہ کے آثار دیکھنے کے لیے نکلنے کا تھا۔ شیخ عقیل عطاس سے پروگرام پہلے ہی طے ہو چکا تھا، چنانچہ وہ اور ان کے بیٹے امین اپنی موٹر لیکر بروقت ہمارے ہاں آ پہنچے۔ ان کے ساتھ شیخ سلیمان الصنیع بھی تھے۔ ان سے طے پایا کہ آغاز جبل ثور، منیٰ اور عرفات سے کیا جائے۔ جبل ثور (وہ پہاڑ جس میں غار ثور واقع ہے) اور دوسرے آثار ان کے بعد دیکھے جائیں۔

دار الارقم | ہم اس سڑک پر چلے جو صفا کے پاس سے شمال کو منیٰ کی طرف جاتی ہے۔ ابھی ہم صفا کے قریب ہی تھے کہ شیخ سلیمان نے سڑک پر ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ دار الارقم کا نصف حصّہ نئی تعمیرات کے سلسلے میں اب اس سڑک کے نیچے آ گیا ہے اور بقیہ نصف حصہ قریب کی دکانوں میں سے ایک دکان میں شامل کر دیا گیا ہے، گویا اب دار الارقم نامی کوئی عمارت مکہ معظمہ میں موجود نہیں ہے۔

دار الارقم کو دعوت اسلامی کی پوری تاریخ میں جو اہمیت اور اولیت حاصل ہے، وہ کسی

بھی دوسری جگہ کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ہجرت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کفار مکہ کے شر سے بچنے کے لیے چھپ کر جمع ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو صبر و استقلال کی تلقین فرماتے اور اگر قرآن پاک کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو انہیں پڑھ کر سناتے۔ یہی وہ گھر ہے، جس کا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں ذکر آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام یہاں جمع تھے کہ حضرت عمرؓ (جب کہ وہ اسلام نہ لائے تھے) کو اس کی اطلاع ملی اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بزعم خود قتل کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکلے۔ راستے میں انہیں اپنی بہن اور بہنوئی کے مسلمان ہو جانے کی خبر ہوئی، چنانچہ وہ ان کی طرف پلٹ گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے خود ان کا دل اسلام کے لیے کھول دیا۔ سیدھے دارالارقم آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گئے۔ یہ گھر جس کی تاریخ اسلام میں یہ حیثیت اور اہمیت ہو، اس کا سرے سے نام و نشان مٹ جانا ہمارے لیے انتہائی روحانی اذیت کا باعث ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیا کوئی بھی ایسی سکیم نہیں بن سکتی تھی کہ یہ گھر اپنی جگہ قائم رہتا اور سڑکوں اور دکانوں کو کسی اور طرح سے تعمیر کر لیا جاتا؟

مکہ معظمہ میں جتنے دوسرے آثار ـــ گھر اور مساجد ـــ ہیں، ان کی نسبت تاریخی لحاظ سے بہر حال یقینی نہیں ہے، لیکن دارالارقم کی نسبت تاریخی لحاظ سے تقریباً یقینی اور قطعی تھی۔ یہ جس جگہ پر آج سے چند سال پہلے تک قائم تھا، تمام مسلمان بادشاہوں اور امراء نے اس کی اس لحاظ سے ہمیشہ حفاظت کی کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں دارالارقم قائم تھا۔ ہر دور میں اس جگہ قرآن و حدیث کی تعلیم کا کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری رہا۔ عمارتیں اگرچہ گرتی اور پھر سے بنتی رہی ہوں گی، لیکن بہر حال جگہ وہی رہی۔ آخری عمارت جسے ۱۹۵۹ء میں ہم نے خود دیکھا ہے، غالباً نویں صدی ہجری کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے دروازے پر بھی دارالارقم لکھا ہوا تھا اور اس کے اندر بھی دو بڑے پتھر رکھے ہوتے تھے، جن میں سے ایک پر یہ عبارت کندہ تھی:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ فی بیوت اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیھا اسمہ، یسبح لہ فیھا بالغدو والآصال۔ ھذا مختبأ رسول اللہ و دار الخیزران وفیھا مبدأ الاسلام"

دوسرے پتھر پر عمارت کے بانی کی حیثیت سے "ابوجعفر محمد بن علی بن ابی منصور الاصفہانی وزیر الشام والموصل" کا نام کندہ تھا۔ ہمارے پہلے سفر کے زمانہ میں شیخ ابوالسمح عبدالظاہر مرحوم کا درس قرآن و حدیث وہاں ہوا کرتا تھا۔ مگر اب ہم وہاں کیا دیکھتے؟ افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تاریخی آثار سے سعودی حکومت کا تغافل ایک ایسی چیز ہے جو عرب کی سیاحت کرنے والے کو بُری طرح کھٹکتی ہے۔ مشرکانہ افعال کو روکنا بالکل برحق۔ مگر اسلام کے نہایت قیمتی آثار تاریخ کو ضائع کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

جبل ابوقُبَیس آگے بڑھے، تو وہاں سڑک کے ساتھ ہی ایک پہاڑی سلسلہ ملا، جو حرم سے بھی حجر اسود کے رُخ سے نظر آتا ہے۔ اسے جبلِ ابی قبیس کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو ہاشم اسی طرف آباد تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انشقاقِ قمر کا معجزہ بھی اسی پہاڑ پر واقع ہوا تھا، اگرچہ یہ بات قطعی نہیں ہے۔

آگے بڑھے تو سڑک کی دائیں طرف زرد رنگ کی ایک خوبصورت عمارت میں لڑکیوں کا مدرسہ آیا۔ اس کے متعلق بتایا گیا کہ یہ عمارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش پر واقع ہے۔ اس سے کچھ پہلے سڑک کی دائیں طرف ہی چند گلیاں اور ان میں لوگوں کے مکانات اور دکانیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ شعبِ ابی طالب اسی جگہ تھی۔ اب پہاڑوں کو صاف کر دیا گیا ہے اور لوگوں نے صاف زمین پر دکانیں اور مکانات تعمیر کر لیے ہیں۔ ان ہی گلیوں میں ایک جگہ کو حضرت علیؓ کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے۔ شعبِ ابی طالب جبلِ ابی قبیس سے ملی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان ایک گھاٹی تھی، جہاں ہجرت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ بنو ہاشم تین سال تک محصور رہے اور کفارِ مکہ

نے حضور کے پورے قبیلے کا معاشی و معاشرتی مقاطعہ کیسے رکھا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش کے سامنے سڑک سے دوسری طرف حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوسفیانؓ کے مکانات کی جگہ بتائی جاتی ہے۔

مسجد الرآیہ اور مسجد الجن کچھ اور آگے بڑھے تو سڑک کی بائیں طرف ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ اس کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ مسجد الرأیہ ہے۔ مسجد الرأیہ اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس جگہ واقع ہے جہاں فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پرچم (جھنڈا) نصب فرمایا تھا۔

اس سے کچھ ہی آگے ایک اور مسجد ہے جسے مسجد الجن کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ مسجد اس جگہ واقع ہے جہاں جنوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا تھا اور پھر وہ ایمان لائے تھے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ — آپ کہہ دیجیے کہ میری طرف وحی ہوئی کہ چند جنوں
الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ — نے مجھے (قرآن پڑھتے) سنا، تو انہوں نے کہا
اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا — کہ ہم نے ایک حیرت انگیز کلام سنا ہے جو بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے

المعلیٰ کا قبرستان کچھ اور آگے بڑھے تو بائیں ہاتھ کو مکہ معظمہ کا قبرستان جسے المعلیٰ یا المعلاۃ کہا جاتا ہے آگیا۔ المعلیٰ جاہلیت کے زمانہ سے آج تک اہل مکہ کا قبرستان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب، چچا ابوطالب، اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہؓ اور دوسرے تمام اعزہ یہیں دفن ہوئے ہوں گے اور بہت سے صحابہ کرام اور بعد کے صلحاء و فقہاء و محدثین کی قبریں بھی یہیں ہوں گی، لیکن ان کی جگہوں کا تعین قطعی ناممکن ہے۔ نجدیوں کی حجاز میں آمد سے پہلے یہاں بہت سی پختہ قبروں پر بڑے شاندار قبے بنے ہوئے تھے جو بڑے بڑے صحابہ کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور لوگ ان پر طرح طرح کے نذرانے پیش کرتے تھے۔ نجدیوں نے آکر ان تمام قبوں کو گرا دیا اور پختہ قبروں کو مسمار کر دیا۔ اب یہاں کوئی پختہ قبر نہیں ہے۔ اب بھی بعض قبروں کو بعض صحابہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن اس نسبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس قبرستان میں ایک جگہ پر حضرت خدیجہؓ، حضور کے دادا عبد المطلب، چچا ابوطالب اور والدہ آمنہ کی قبروں کی نشاندہی کی جاتی تھی لیکن سعودی حکومت نے ان قبروں کو بھی مسمار کر کے ان کے آگے پختہ دیوار بنا دی ہے تاکہ کوئی شخص اس دیوار سے آگے نہ بڑھ سکے۔

طریق کَدا معلیٰ کا قبرستان شمال اور جنوب دونوں طرف سے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے

ان پہاڑیوں کے درمیان سے شمال مغرب کو ایک راستہ جاتا ہے، جسے کدا کہا جاتا ہے اور یہ وہی راستہ ہے جس سے فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے۔

جبلِ نور آگے بڑھ کر منیٰ جانے کے لیے یہ سڑک دائیں طرف ۔ جنوب مشرق ۔ مڑ جاتی ہے۔ موڑ سے تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں جبلِ نور دکھائی دیا۔ ہم کچھ دیر سڑک پر چلتے رہے۔ پھر نیچے اتر گئے۔ ایک آدھ منٹ اور چلے ہوں گے کہ پہاڑ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ جبلِ نور اس پہاڑ کا نیا نام ہے، ورنہ اس کا قدیم نام جبلِ حراء ہی مشہور رہے۔ اسی کے اندر وہ غار واقع ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ حرم سے اس کا فاصلہ ڈھائی یا تین میل ہوگا۔ مولانا کا اندازہ ہے کہ یہ دو ہزار فٹ کے قریب اونچا ہے۔ غارِ حرا تک پہنچنے کے لیے دو مرتبہ پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا پڑتا ہے اور اس میں ۔ لوگوں کے بتانے کے مطابق ۔ کم از کم دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ہم اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے مگر وقت بہت تنگ تھا، اس لیے اسے کسی اور دن کے لیے ملتوی کر دیا، مگر افسوس کہ بعد میں بھی اس کا موقع نہ مل سکا اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

جبلِ نور کے دامن میں سعودی حکومت نے حال ہی میں ایک بند تعمیر کرایا ہے، جس سے پہاڑوں پر بارش کا پانی منتشر ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے، ورنہ جب تک یہ بند تعمیر نہ ہوا تھا، آئے سال پانی حرم کے اندر پہنچ جاتا تھا اور بڑی مشکل پیش آتی تھی۔

منیٰ سے عرفات تک اس کے بعد ہم آگے بڑھے اور منیٰ پہنچ گئے۔ عمارتیں اپنی جگہ قائم تھیں، لیکن ان میں کوئی آبادی نظر نہ آرہی تھی۔ یہ بھی خوب شہر ہے۔ سال بھر میں صرف تین دن آباد ہوتا ہے اور یک لخت اس کی آبادی آٹھ دس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ ان تین چار دنوں کے اندر مکانوں کے مالکان حاجیوں سے اتنا کرایہ وصول کر لیتے ہیں جو بڑے شہروں میں اتنی جگہ کے لیے سال بھر میں بھی وصول نہیں ہوتا۔

منیٰ کے وسط میں مسجد الخیف ہے اور یہ اس جگہ واقع ہے جہاں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا اور صحابہ کرام کے ساتھ پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ جمرۂ اولیٰ و ثانیہ کے درمیان ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے جسے مسجد المنحر کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں

کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کے اونٹ یہاں ذبح فرمائے تھے، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جمرۂ عقبہ (جمرۂ کبریٰ) سے کچھ پہلے ایک چھوٹی سی اور مسجد ہے جسے مسجد العشرہ کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے سال مدینہ کے جن دس آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ یہاں جمع ہوئے تھے۔ جمرہ کے ساتھ ہی ایک اونچی سی جگہ تھی، جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں دوسرے سال مدینہ منورہ کے ۷۲ آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، جو تاریخ کی کتابوں میں بیعت عقبہ کے نام سے مشہور ہے اور اسی لیے اس جمرہ کا نام بھی جمرۂ عقبہ رکھا گیا ہے۔ مگر یہ جگہ بھی اب نئی سڑک کے نیچے آگئی ہے، حالانکہ بیعتِ عقبہ جیسے اہم واقعہ کی تاریخی یادگار کو ذرا سی توجہ سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔

منیٰ کے بعد ہم وادیٔ مُحَسّر ہوتے ہوئے مزدلفہ آئے۔ وادیٔ مُحَسّر وہ وادی ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے پرندوں نے اللہ کے حکم سے کنکریاں برسا کر ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحاب الفیل) کو ختم کیا تھا۔ یہ معذّب وادی ہے۔ اس لیے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا تھا کہ اسے جلد از جلد پار کر جائیں۔ اس کے دونوں طرف پہاڑیوں کا سلسلہ کچھ اس قسم کا ہے اور اس طرح مسلسل چلا جا رہا ہے کہ اس سے گزرتے ہوئے واقعی خوف آتا ہے۔

مزدلفہ وہ جگہ ہے جہاں عرفات سے پلٹتے ہوئے حاجی ایک رات بسر کرتے ہیں اور رمی جمار کے لیے کنکریاں جمع کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کا نام المشعر الحرام مذکور ہے۔ المشعر الحرام اب صرف اس مسجد کا نام ہے، جو اس کے اندر بنی ہوئی ہے۔ یہاں اس مسجد کے سوا کوئی دوسری عمارت نہیں ہے۔

مزدلفہ کے بعد حرم کے حدود ختم ہو جاتے ہیں اور جہاں یہ حدود ختم ہوتے ہیں وہاں نشانات لگے ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حج میں اور لوگ تو عرفات تک جاتے

تھے، لیکن قریش مزدلفہ سے آگے نہ بڑھا کرتے تھے، کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں، اس لیے حرم کے حدود سے باہر نہ نکلیں گے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد خداوندی "ثم افیضوا من حیث افاض الناس" کے تحت عام لوگوں کے ساتھ خود بھی عرفات تک گئے۔

مزدلفہ سے عرفات جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ دائیں ہاتھ کو ہے، جسے طریق ضب کہا جاتا ہے۔ اسی راستہ سے حاجی مزدلفہ سے عرفات جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ بائیں ہاتھ کو ہے، جسے طریق المأزمین کہا جاتا ہے۔ اس راستہ سے حاجی عرفات سے مزدلفہ واپس آتے ہیں۔

عرفات میں مسجد النمرہ کے علاوہ صرف ایک عمارت نظر آئی، جو حج کے موقع پر عملہ کے دفتر کا کام دیتی ہے۔ یہاں عمارتوں کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہاں حاجی صرف چند گھنٹے ٹھہرتے ہیں اور اس کے لیے خیمے کافی ہوتے ہیں۔ آج سے چند سال پہلے تک عرفات میں صرف دو سڑکیں تھیں، اس لیے حاجیوں کو مغرب کے بعد مزدلفہ واپس جانے میں بڑی دقت پیش آتی تھی، لیکن اب یہاں پانچ سڑکیں بنا دی گئی ہیں، جن سے بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۶ء تک غالباً یہاں دو ہی سڑکیں تھیں، اس لیے بس نے ہمیں مغرب کے وقت عرفات سے چل کر رات کے ۱۲ یا ۱ بجے مزدلفہ پہنچایا تھا۔ اب یہاں جابجا پانی کے نلکے بھی لگا دیے گئے ہیں۔ تاکہ حاجیوں کو پانی کے سلسلے میں بھی کوئی پریشانی نہ ہو۔

عرفات کے ساتھ ہی شمال کی طرف مسجد نمرہ کے عین سامنے وادی عرنہ ہے۔ جس میں حج کے موقع پر وقوف منع ہے۔

عرفات پہنچ کر ہم جبل الرحمہ پر چڑھے جس کا قدیم نام جبل الالال تھا۔ اب اسے جبل الرحمہ کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کے دامن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو وعظ فرمایا تھا۔ اس کے دامن میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف اس جگہ تھا۔ اس کے اوپر بھی ایک مسجد بنی ہوئی ہے اور اس کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف یہاں تھا۔ ہم نے مغرب کی نماز پہاڑی کے اوپر والی مسجد میں

پڑھی۔ پھر نیچے اتر آئے۔ یہاں بہت سے قہوہ خانے بھی بنے ہوتے ہیں۔ حج کے علاوہ دوسرے دنوں میں مکہ کے بہت سے لوگ سیر و تفریح کے لیے شام کو اِدھر آجاتے ہیں، اس لیے یہ قہوہ خانے سال بھر آباد رہتے ہیں۔ ہم بھی ایک جگہ بیٹھے چائے پی اور کچھ دیر آرام کر کے شارع المنصور کے راستے مکہ معظمہ واپس آگئے۔ شارع المنصور ایک نئی سڑک ہے جو براہ راست مکہ معظمہ سے عرفات کو جاتی ہے۔ اس سے وقوف عرفہ کے روز سامان لانے لے جانے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

استاذ احمد محمد جمال | اگلے روز (۳ دسمبر) علی الصباح استاذ احمد محمد جمال ہمارے ہاں تشریف لائے اور کافی دیر تک بیٹھے پاکستان کے حالات سنتے اور اپنے ہاں کے حالات سناتے رہے۔ استاذ احمد محمد جمال سے وہ تمام لوگ ضرور واقف ہوں گے، جنہوں نے اسلامک کلوکیم (۵۸-۱۹۵۷ء) میں ہمارے ہاں کے بعض متجددین کے خلاف ان کی تقاریر سنی ہیں۔ یہ اور ان کے بڑے بھائی صالح محمد جمال مکہ معظمہ کے ایک روزانہ اخبار "الندوہ" کے اڈیٹر ہیں۔ "مکتبۃ الثقافۃ" کے نام سے ان کا ایک مکتبہ بھی ہے جو مکہ معظمہ کا سب سے بڑا مکتبہ ہے۔ یہ دونوں بھائی حسن البنا شہیدؒ کی دعوت سے متاثر ہیں، اسی لیے بڑے سلجھے ہوئے خیالات رکھتے ہیں۔ صالح محمد جمال کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ صحافیوں کے ایک وفد میں ظہران گئے ہوئے ہیں، اس لیے ہماری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اسی روز عصر کے بعد نسیم حجازی صاحب اور ان کے ساتھ راولپنڈی کے وکیل قاضی نذیر احمد صاحب عمرہ کے لیے مکہ معظمہ پہنچے اور ان سے مختصر ملاقات رہی۔

پھر عشاء کے بعد ہم بازدید کے لیے شیخ عبدالمہیمن کے ہاں گئے۔

اگلے دن (۴ دسمبر) ہم عبداللہ بن کلیب کے ہاں صبح کے ناشتہ پر گئے۔ ان کی رہائش حرم سے کافی دور محلہ جرول میں ہے۔ وہاں ہماری ملاقات ان کے ایک دوست زکریا صاحب سے بھی ہوئی۔ یہ انڈونیشیا کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم کی غرض سے کئی سال مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں بھی رہ چکے ہیں، اس لیے اردو اچھی جانتے ہیں۔ ہم سے اردو ہی میں بات چیت

کرتے رہے۔ مولانا کی اکثر کتابوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان میں سے بعض کا انڈونیشی زبان میں ترجمہ بھی کر چکے تھے۔

مزید آثار کی زیارت ½۱ بجے کے قریب ہم پھر آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ اب کی مرتبہ ہمارے ساتھ مکہ معظمہ کے ایک تاجرِ عطر محمد عالم صاحب اور عبداللہ بن کلیب تھے۔ محمد عالم صاحب کی پیدائش ہندوستان ہی میں کسی جگہ کی ہے، لیکن یہ بچپن ہی میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ اب وہاں ان کا عطر کا کاروبار ہے اور ماشاء اللہ وہ اس میں بڑے کامیاب ہیں۔ ان سے ہماری پہلی ملاقات گذشتہ سفر (۱۹۵۶ء) کے دوران عمان میں ہوئی، جب ہم عمان سے دمشق جانے کے لیے موٹر میں سوار ہو رہے تھے، تو یہ بھی بیت المقدس کی زیارت کے بعد دمشق آ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی موٹر میں سوار ہو گئے۔ اس سے پہلے مولانا سے واقف تھے، لیکن ملاقات نہ ہوئی تھی۔ پھر حج کے موقع پر بھی ملاقات رہی۔ اب کی مرتبہ انہوں نے آثار دکھانے کی خود ہی پیش کش کی جسے ہم نے قبول کر لیا۔

مسجد مُحَصَّب و مسجد الکبش ہم پہلے منیٰ گئے۔ وہاں مسجد مُحَصَّب، مسجد الکبش اور بعض دوسری مساجد باہر ہی سے دیکھیں۔ مسجد محصّب منیٰ کے راستے میں ہے اور لوگوں کے کہنے کے مطابق اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں حجۃ الوداع سے واپس ہوتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ مسجد الکبش منیٰ کے اندر ہے اور یہ اس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں کے متعلق لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم نے اس جگہ مینڈھا ذبح کیا تھا۔ یہ سب مسجدیں ترکی عہد کی بنی ہوئی ہیں۔ نجدی حضرات کے برعکس ترک اور اشرافِ مکہ بہت خوش عقیدہ واقع ہوئے تھے، اس لیے ہر اس جگہ کوئی نہ کوئی مسجد بنا ڈالتے تھے، جس کے متعلق انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہاں فلاں واقعہ پیش آیا ہو گا۔ اس لیے جن علماء نے مکہ معظمہ کے آثار کی تحقیق کی ہے وہ گھروں اور مسجدوں میں دارالارقم کی نسبت کو تو بڑی حد تک صحیح مانتے ہیں، لیکن دوسرے آثار کی نسبت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ محمد عالم صاحب بہت سی چٹانوں کے درمیان سے گزارتے ہوئے

ہمیں ایک اور جگہ بھی لے گئے، جس کے متعلق بھی یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مینڈھا یہاں ذبح کیا تھا۔

جبلِ ثور اس کے بعد ہم جبلِ ثور — وہ پہاڑ جس میں غارِ ثور واقع ہے — دیکھنے کے لیے شارع المنصور کی طرف روانہ ہوئے۔ جب سڑک کے نشانات کے مطابق مکہ معظمہ ۹ میل رہ گیا تو جبلِ ثور ہمارے بالکل سامنے تھا، اگرچہ اس کا فاصلہ سڑک سے آدھ میل ہو گا۔ جبلِ نور کی نسبت اس کی اونچائی زیادہ ہے اور اس پر چڑھنے کا راستہ بھی بہت خطرناک ہے۔ غارِ ثور اس کے عین اوپر ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پر چڑھنے کی ہمت کرتے ہیں، اور جو لوگ چڑھتے ہیں وہ پانی اور کھانا ساتھ لیکر علی الصباح چڑھنا شروع کرتے ہیں اور دوپہر تک اوپر غار تک پہنچتے ہیں۔ شاید ہم اس پر چڑھنے کی ہمت کر جاتے، لیکن وقت بہت زیادہ ہو گیا تھا اور دھوپ تیز ہو گئی تھی اور پھر ہمارے پاس کھانے پینے کا بھی کوئی سامان نہ تھا۔ ہم نے موٹر کو سڑک سے نیچے اتار کر اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کی، مگر ایک جگہ ریت میں ہماری موٹر ہی پھنس گئی۔ بڑی مشکل سے اسے باہر نکالا اور سڑک پر واپس پہنچ گئے۔

غارِ ثور وہ جگہ ہے جہاں ہجرت کے موقع پر کفارِ مکہ سے چھپنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پناہ لی تھی، اور جس کا قرآنِ کریم کی اس آیت میں ذکر ہوا ہے:

... اذ اخرجه الذين كفروا ثانی اثنين اذ هما فی الغار اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا	... جب کافروں نے اس کو (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو) نکال دیا۔ وہ دو میں سے دوسرا تھا (ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ) جب کہ وہ دونوں غار میں تھے، اور وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ غار مکہ معظمہ کے جنوب میں واقع ہے۔ قدیم زمانہ میں مکہ سے یمن کو جو راستہ جاتا تھا وہ اس کے قریب سے گزرتا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تو مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے اور مدینہ منورہ مکہ کے شمال میں ہے، اس لیے وہ جنوب کی طرف کیسے آتے اور پھر خاص طور پر اسی غار کا انتخاب انہوں نے کیونکر کیا، جب کہ پہاڑ کی اس قدر بلندی پر اس کا پتہ لگانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر اردگرد کے بہت سے پہاڑ ایسے ہیں جو اپنی شکل و صورت اور اونچائی میں اس پہاڑ سے مشابہ ہیں۔ ممکن ہے یہ انتخاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ کیا ہو یا یہ کہ آپ کو یا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مکہ معظمہ کے اردگرد پہاڑوں سے اتنی واقفیت ہو کہ آپ اس غار کو پہلے سے جانتے ہوں۔ بہرحال چھپنے کے لیے اس غار کے انتخاب میں مصلحت یہ تھی کہ کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے راستہ میں تلاش کرتے رہے حالانکہ حضورؐ اس کے برعکس سمت میں یمن کے راستہ پر ایک ایسے غار میں چھپے ہوئے تھے جس کی طرف ان کا گمان بھی نہ جا سکتا تھا۔

شیخ عقیل عطاس کی دعوت اسی روز ظہر کے بعد شیخ عقیل عطاس کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی، اس کے لیے انہوں نے بڑا ہی اہتمام کیا۔ ہمارے علاوہ اس میں شیخ محمد نصیف، استاذ سعید اِ مودی (ایڈیٹر ماہنامہ الحج) استاذ احمد محمد جمال، استاذ عبدالقدوس انصاری (ایڈیٹر ماہنامہ المنہل)، استاذ احمد السباعی (ایڈیٹر ہفتہ وار قریش)، شیخ عبدالرحمٰن مظہر (ہند و پاکستان کے لیے مطوفین کے صدر) اور استاذ احمد الغزاوی (شاہ سعود کے خاص شاعر اور مجلسِ شوریٰ کے نائب صدر) بھی شامل تھے، اچھا ہوا اس بہانے ان تمام حضرات سے ملاقات ہو گئی۔

اسی روز عشاء کے بعد ہم لوگ مقبول عبدالکافی کے ہاں جرول گئے۔ وہاں بہت سے نوجوان جمع تھے، جن میں بعض مکہ ہی کے رہنے والے تھے اور بعض خاص طور پر جدہ سے آئے

تھے۔ استاذ احمد علی مدیر کلیۃ الشریعہ) اور شیخ عبدالرزاق حمزہ (خطیب حرم مکی جو ان دنوں علاج کے سلسلے میں مصر گئے ہوئے تھے) کے صاحبزادے بھی موجود تھے۔ یہ تمام نوجوان مولانا کی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے مولانا سے مختلف موضوعوں پر سوالات کرنا شروع کیے۔ ان کے سوالات اسی قسم کے تھے جس قسم کے اس سے پہلے ریاض اور ظہران کے نوجوان پیش کر چکے تھے۔ عرب قومیت کے خلاف ان کے جذبات خاص طور پر سخت تھے۔ مولانا نے ان کے تمام سوالات کا اطمینان کے ساتھ جواب دیا، جس کا ان سب پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔

شیخ عبدالمالک بن ابراہیم اگلے روز ۱۴ دسمبر ہم شیخ عبدالمہیمن کے ساتھ شیخ عبدالمالک بن ابراہیم کی ملاقات کے لیے گئے۔ یہ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جب ہم ریاض گئے تھے تو یہ شاہی مسجد کے خطیب تھے۔ اب حجاز میں ہیئۃ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے صدر ہیں۔ ان سے کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی۔ ریاض میں علماء و امراء کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ چلتے وقت انہوں نے کتابوں کی ایک اچھی مقدار ہمیں بطور ہدیہ پیش فرمائی۔

شیخ عبدالوہاب دہلوی واپسی میں ہم شیخ عبدالوہاب دہلوی اور ان کے چچا شیخ اسماعیل کے ہاں حاضر ہوئے۔ ان کا خاندان دہلی والوں کا مشہور خاندان ہے جو گزشتہ ساٹھ سال سے مکہ ہی میں آباد ہے، لیکن اپنے لباس، زبان، طرز رہائش ہر چیز میں ابھی تک سخت دہلوی ہے۔ شیخ عبدالوہاب صاحب بڑے عالم اور محقق آدمی ہیں، ان کا کتب خانہ بھی بہت وسیع ہے، اگرچہ لکھتے بہت کم ہیں۔ کبھی کبھار ہی ان کے مضامین الحج اور بعض دوسرے پرچوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ان کی صحت خراب چلی آرہی ہے۔ دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ وہ مولانا سے تفہیم القرآن کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ دوران گفتگو مولانا ابوالکلام مرحوم کے متعلق انہوں نے ایک عجیب بات بتائی کہ جب

ان کی تفسیر سورۃ فاتحہ شائع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس میں آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر سرے سے نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں کلکتہ گیا اور وہاں ان سے ملا، تو میں نے تفسیر میں اس کمی کی طرف انہیں توجہ دلائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے میں نے اس آیت کی تفسیر چھوڑ دی۔

اس روز جمعہ تھا۔ حرم میں جمعہ پڑھنے کے بعد ہم لوگ طائف کے لیے روانہ ہو گئے۔

مکہ سے طائف مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان غالباً کوئی باقاعدہ بس سروس نہیں ہے۔ صرف چھوٹی کاریاں (ٹیکسیاں) آتی جاتی ہیں۔ فاصلہ ۱۲۰ کیلومیٹر (۷۵ میل کے قریب) ہے لیکن ٹیکسیوں والے راستے کے خراب ہونے کی وجہ سے کرایہ بہت وصول کرتے ہیں۔ ٹیکسی والے نے ہم سے ۷۵ ریال (۱۴۰ روپے) وصول کیے۔

ہم نے مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد ہی جمعہ کے روز طائف جانا طے کر لیا تھا۔ اتفاق سے ایک روز حرم میں ہمارے ایک پاکستانی بھائی فیض عالم صاحب سے ملاقات ہو گئی، جو چند سال سے طائف ہی میں مقیم ہیں۔ اور اسی روز مکہ سے طائف واپس جا رہے تھے۔ ان کے ذریعے ہم کو طائف میں قیام اور مشاہدۂ مقامات کا انتظام کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی، ورنہ ہمارے لیے طائف بالکل اجنبی مقام تھا اور وہاں ہم کسی کو نہ جانتے تھے۔

جس راستے سے ہم گئے وہ مکہ اور منیٰ کی سڑک پر کچھ دور چل کر بائیں ہاتھ مڑ جاتا ہے پھر جبل نور کے دامن سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ کر ہم جعرانہ کی طرف مڑ گئے۔ یہ جعرانہ وہی جگہ ہے جہاں غزوۂ حنین و طائف کے بعد طائف سے واپسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن و ثقیف کا مال غنیمت صحابۂ کرام میں تقسیم فرمایا تھا۔ یہ راستہ اگرچہ بہت چلتا ہوا اور باقاعدہ بنا ہوا ہے، لیکن بالکل کچا ہے۔ کہیں سخت ریت آتی ہے اور کہیں پتھریلی زمین۔ دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد یہ راستہ بھی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ بائیں طرف کا راستہ جعرانہ کو جاتا ہے اور دائیں طرف کا شرائع کو۔ ہم شرائع کے راستہ پر چلتے رہے اور کوئی پندرہ بیس

منٹ اور چلنے کے بعد شرائع پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے اور ایک چشمہ کی وجہ سے آباد ہے۔ جعرانہ یہاں سے ٹھیک شمال کو واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ جعرانہ اور شرائع کے درمیان وہ وادی ہے جہاں جاہلیت کے زمانے کے تین مشہور بازاروں (عکاظ، مجنّہ اور ذی المجاز) میں سے مجنّہ کا بازار لگا کرتا تھا۔

شرائع سے تقریباً نصف گھنٹہ چلنے کے بعد ہم زَیمہ پہنچے، جو ایک نہایت ہی سرسبز و شاداب جگہ ہے اور یہاں بہت سے باغات اور چشمے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے درختوں کے علاوہ ہمیں وہاں کیلے کے درخت بھی نظر آئے۔ یہاں اتر کر ہم نے عصر کی نماز پڑھی اور پھر آگے روانہ ہوئے۔ زَیمہ کے بعد جو راستہ شروع ہوا، وہ بہت ہی تکلیف دہ (عربوں کی عامی زبان میں اَبطال) تھا۔ اس پر پتھر کے ٹکڑے اس طرح بکھرے ہوئے تھے جس طرح کسی جگہ نئی سڑک بنانے کے لیے پتھر کے ٹکڑے ڈال دیئے جاتے ہیں اور بعض جگہ ان کے اس طرح ڈھیر بنے ہوئے تھے کہ موٹر کے لیے ان میں سے راستہ نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ پتھر کے ان ٹکڑوں کو بارش کے زمانہ میں پہاڑی نالے بہالاتے ہیں۔ حکومت آئے دن ان سے راستہ کو صاف کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے مگر بارش کا پانی ہمیشہ ان کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اس راستہ میں ہماری موٹر کا ٹائر پھٹ گیا اور اس کی وجہ سے ہمارا بہت سا وقت ضائع ہوا۔

تقریباً پندرہ سولہ میل تک راستے کا یہی حال رہا۔ اس کے بعد قدرے اچھا راستہ آگیا لیکن پہاڑوں کے درمیان گھر گیا اور نمایاں طور پر چڑھائی محسوس ہونے لگی۔ ڈرائیور کافی زور لگا کر موٹر چلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا اور ہم السیل الکبیر پہنچ گئے۔

السیل الکبیر ایک کھلی وادی میں واقع ہے، اور اس میں جا بجا چائے کی بہت سی دکانیں ہیں، جو حج کے دنوں میں تو بہت آباد رہتی ہیں، لیکن اس وقت بھی ہمیں ان پر اچھی خاصی رونق نظر آئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہی السیل الکبیر وہ قرن المنازل ہے جس کو حدیث میں اہلِ نجد کے لیے میقات قرار دیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قرن المنازل اس کے دائیں طرف

(یعنی جنوب میں) ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اور یہ اس کے قریب اور اس کی سیدھ میں واقع ہے، اس لیے طائف اور نجد کی طرف سے آنے والے تمام حاجی یہیں سے احرام باندھتے ہیں، اس لیے یہاں بہت سے غسل خانے پاٹے جاتے ہیں، جن میں پیسے دے کر غسل کیا جا سکتا ہے۔ ایک شاندار نئی مسجد بھی یہاں بنی ہوئی ہے۔ ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں پڑھی۔ ایک نجدی امام صاحب نے جماعت کرائی اور اتنی تیز نماز پڑھائی کہ ہمارے لیے ان کی متابعت مشکل ہو رہی تھی۔

السیل الکبیر کے بعد تھوڑی دور تک راستہ پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا ہے، جس پہاڑ کو کاٹ کر یہ راستہ بنایا گیا ہے، مشہور مصری صحافی محمد حسین ہیکل نے اس کا نام ذات عرق لکھا ہے۔ ذات عرق کا ذکر حدیث میں اہل عراق کے لیے میقات کے طور پر آتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ذات عرق یہاں سے شمال کی طرف نجد میں عُشَیرہ کے قریب کسی جگہ کا نام ہے۔ یہ پہاڑ تو بہر حال اسی زمانہ میں کاٹا گیا ہے۔ پہلے زمانہ میں جو لوگ اس راستے سے سفر کرتے تھے، وہ اس پہاڑ کے گرد چکر لگا کر آتے ہوں گے۔ غزوۂ حُنَین کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام طائف کا محاصرہ کرنے کے لیے اسی راستہ سے تشریف لائے تھے، انہیں بھی یقیناً اس پورے پہاڑ کے گرد چکر لگانا پڑا ہوگا۔

اندھیرے میں اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا، لیکن کہتے ہیں کہ اس پہاڑ کے بعد راستہ دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دائیں طرف کا راستہ طائف کو جاتا ہے (اور ہم اسی پر چلتے رہے ہوں گے) اور بائیں طرف کا راستہ عُشَیرہ سے ہوتا ہوا ریاض کو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اور جگہ آئی، جسے السَّیل الصغیر کہا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں ٹھہرے بغیر اپنا سفر جاری رکھا۔ راستہ کا وہی حال تھا۔ کہیں سخت پتھر آ جاتے، جن میں موٹر بہت ہی آہستہ رفتار سے چلتی اور کہیں قدرے ہموار راستہ آ جاتا، جس میں موٹر خوب تیز چلتی۔ یہاں بھی ایک جگہ ہماری موٹر کا ٹائر پھٹ گیا۔ ڈرائیور نے اندھیرے میں بڑی مشکل سے اس کی

جگہ دوسرا ٹائر لگایا اور ہم آگے روانہ ہو سکے۔ شکر ہے ڈرائیور نے عقلمندی کی اور السیل الکبیر میں ٹائر کی مرمت کر دی تھی، ورنہ معلوم نہیں ہم پر کیا گزرتی؟ جب ہم طائف سے صرف ۲۷ کیلو میٹر (۱۹ میل کے قریب) رہ گئے تو حوایا کا مقام آیا جہاں طائف کا ہوائی اڈہ ہے۔ اور یہاں سے طائف تک نہایت عمدہ پختہ سڑک جاتی ہے۔ اس سڑک پر پہنچ جانے کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

طائف رات کے دس بجے کے قریب ہم طائف پہنچے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں فیض عالم صاحب اور دوسرے احباب نے مایوس ہو کر ہمارا انتظار نہ چھوڑ دیا ہو، کیونکہ اصل میں تو ہم نے انہیں مغرب کے بعد پہنچ جانے کا وقت دیا تھا، لیکن الحمدللہ جونہی ہم شہر میں داخل ہوئے فیض عالم صاحب اور ان کے ساتھ توختہ اخوند ایک موڑ پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ توختہ اخوند ایک ترکستانی مہاجر ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے مولانا مودودی کے پاس کئی سال تک رہ چکے ہیں۔ پھر یہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ اب کئی سال سے طائف میں مقیم ہیں۔ ہمیں طائف میں ان کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ یکایک چودہ برس کے بعد ان کی مولانا سے یہ پہلی ملاقات تھی، اس لیے بہت ہی محبت اور عقیدت کے عالم میں بغلگیر ہوئے۔

ترک مہاجرین ہمارے قیام کا انتظام ان لوگوں نے محلۂ بخاریین میں کیا تھا، جس کی زیادہ تر آبادی روسی ترکستان کے مہاجرین ہی پر مشتمل ہے اور اسی لیے اسے محلہ بخاریین کہا بھی جاتا ہے۔ ہم جس گھر میں ٹھہرے تھے، اس کے ساتھ محلہ کی مسجد تھی اور اس کے امام و خطیب بھی ایک ترکستانی عالم قاری عبدالسلام صاحب تھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی بہت سے ترکستانی حضرات تشریف لے آئے، اور کافی دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ وہ تھے جو روسی انقلاب کے بعد اپنے وطن سے ہجرت کر کے پہلے ہندوستان آئے تھے اور وہاں کافی عرصہ رہ کر عرب منتقل ہو گئے تھے۔ اس لیے اردو نہ صرف یہ کہ اچھی خاصی جانتے تھے بلکہ ہم سے اردو ہی میں بات چیت کرتے رہے۔ ہمارے

تو ختہ اخوند کی زبان خوب تھی۔ گویا ترکی، فارسی، اردو اور عربی کا مرکب اور مرکب بھی نہایت دلچسپ، مثلاً اگر انہیں یہ کہنا ہوتا کہ پانی نہیں آیا، تو وہ کہتے تھے "آب ما آیا" اسی طرح کے اور بھی بہت سے دلچسپ فقرے وہ بولا کرتے تھے، جنہیں میں بھول گیا۔ طائف میں ان ترکستانی مہاجرین کے سوا کسی اور سے ہماری واقفیت نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی واقفیت کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جس محبت، اخلاص اور عقیدت سے ان حضرات نے ہمارا استقبال کیا اور دو دن تک ہماری مہمانی کی، اس کا کسی دوسرے میزبان میں پایا جانا مشکل تھا۔ محبت، سنجیدگی اور خلوص کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں طور پر ظاہر ہو رہے تھے۔ ان کے متعلق ہمیں یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور قدرے خوشی بھی کہ ان لوگوں نے عرب میں بھی اتنا عرصہ رہ کر اپنا لباس تبدیل نہیں کیا نہ صرف عرب بلکہ جہاں بھی یہ لوگ رہتے ہیں ہمیشہ اپنا قومی لباس ہی پہنتے ہیں۔ بہروپیوں کی طرح جگہ جگہ لباس تبدیل نہیں کرتے پھرتے۔ یہ اس بات کی نمایاں دلیل ہے کہ ان حضرات کے اندر مضبوط قومی کیرکٹر پایا جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں اپنے وطن کو آزاد کرانے اور اس میں پھر سے اسلام کا بول بالا کرنے کا جذبہ پوری طرح موجزن ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزائم میں برکت دے اور دنیا کو ان کا مسئلہ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

طائف کا موسم | طائف میں اگرچہ مکہ معظمہ کی نسبت کافی سردی تھی، لیکن اتنی سردی نہیں تھی جس کا تصور ہم اپنے ذہن میں لیے ہوئے تھے۔ لوگ بھی ہمیں طائف کی سردی سے خوب ڈرا رہے تھے۔ حالانکہ وہاں دسمبر میں بس اتنی سردی تھی، جتنی ہمارے یہاں لاہور میں نومبر کے آخر میں ہوتی ہے۔

(باقی)